باب ۱۰

سمٹنا پھیلنا

اک لفظِ محبت کا اتنا سا فسانہ ہے
سمٹے تو دلِ عاشق، پھیلے تو زمانہ ہے

حُب، حُب، حُب۔ فَاَحبَبتُ اَن اُعرَف (اپنی پہچان کا شوق ہوا) شدتِ حُب میں اپنا عرفان چاہا۔ اس کا عرفان جو بے نام بے نشان ہے۔ کنزِ مخفی، بے چون، بے چگون ہے۔ محجوب، ملفوف، مرکوز ہے۔ وہی ب کا نقطہ، وہی ''ھُوَ وحدہٗ لَا الٰہ اِلَّا ھُو'' ۔ مگر

حُسن از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخارا

ظہور کی بیتابی

نورِ سیاہ سے آفتاب نکلنے کے لئے مضطرب۔ نافۂ ذات اپنی خوشبوؤں میں پھوٹ پڑنے کے لئے بے تاب۔ حُسنِ ازلی اپنی رونمائی کے لئے بے چین۔ ایک شدتِ ظہورِ کُن میں ذات نے لباسِ تعینات میں ظہور کیا۔ ''خَلَقتُ الخَلقَ'' کو عشق کی برقِ تجلی سے منور کیا۔ نبی کریمؐ نے فرمایا۔ ''اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰہُ نُورِیْ'' اول اللہ نے میرا نور پیدا کیا۔ اسی نور سے تخلیقِ وحدتِ عالم ہوئی۔

اب خفا نے غیب میں، شہادت نے شہود میں، باطن نے ظاہر میں رونمائی کی۔ حقیقتِ احد، ظہور نورِ احمدؐ بنی۔ حقیقتِ ''محمد رسول اللہ''

عینیت ''لا الہ الّا اللہ'' ہوئی۔ نورِ محمدیؐ نے وحدۃُ الوجود کی شان میں جلوہ گری کی۔ ''وَسِعَ کُلَّ شَیْءٍ'' کے پیرایہ میں ذات کا پھیلاؤ ہوا۔ ذات کے رموز اسماء و صفات میں نکھرے۔ نور کا سمونا ب کا نقطہ پھیل کر بسم اللہ بنا۔ ''اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ'' قرآن قلب پر نازل ہوا۔ حقیقتِ محمدیؐ وجود پر جاری و ساری و طاری ہوئی۔ سفلی نے علوی کو، وجود نے نور کو سمو لیا۔ پہاڑ کو رائی نگل گئی۔ ''عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ'' اپنی پہچان ہی رب کی پہچان ہوئی۔ ''ھُوَ الْاَوَّلُ ھُوَ الْاٰخِرُ۔ ھُوَ الظَّاھِرُ ھُوَ الْبَاطِنُ '' اس ''ھُوَ کُلُّ'' کی تجلی میں حقیقتِ محمدیؐ کو سموئے بغیر، ذات کا عرفان کیسے ہو۔ ہر ظہور کے باطن میں اسی حق کی جلوہ نشانی ہے۔ یہ حُب، یہ عشق، یہ تڑپ، یہ شوقِ نمود، یہ انا، وہی موجِ اوّل ہے۔ ''ھُوَ الْاَوَّلُ ھُوَ الْاٰخِرُ'' ہر مظہرِ حق جب تک ذات میں نہ سمٹے صفات میں کیسے پھیلے جب تک رائی پہاڑ کو نہ نگل لے، کیا اُگل سکتی ہے۔ شاہ نیازؒ نے فرمایا۔

نگل گئی پربت کو رائی دیکھو جی اب اُگلے ہے
نیاز کے پردے میں خدائی دیکھو جی اب نکلے ہے

کیفِ وحدتُ الوجود

اس حالتِ وحدت الوجود میں جیسے خدائی اس کھو کھلے وجود اس مظہرِ حق سے بہہ رہی ہوتی ہے اور یہ خود انا دَھَر کی کیفیت میں مست ہوتا ہے۔ اس کیفیت میں البتہ عاجزی ہوتی ہے۔ سَر پائے ساقی پر ہوتا ہے۔ محبوب ہی کی جلوہ آرائی اس کائنات میں نظر آتی ہے۔ یہ عبد کا مقام ہے۔ مَیں فانی تُو باقی، نہ کوئی دوئی، نہ وہم، نہ شرک، نہ انانیت۔ عشق اس وجود میں چھلک اٹھتا ہے۔

اور یہ حال ہوتا ہے۔

من زجاں فانی بہ جاناں باقیم

''میں جان سے فانی ہوں جاناں میں باقی ہوں''

اس کیفیت میں اپنا شعور، عکس ہی تو ہوتا ہے، اس حقیقت کا جو جاری و ساری ہے۔ جب عکس (اپنے وجود) سے نظر ہٹ کر اصل پر آجائے ،کُل کا شعور آجاتا ہے۔ بت پرستی اور وجود کے شرک سے آزاد ہو جاتا ہے۔ مجردات سے ہم کنار ہو کر اب کہیں یہ وہم دور ہوتا ہے کہ میں خود ایک منفرد چیز ہوں۔ جب کُل کا نظریہ اپنا کر کُل ہو جائے، تب صحیح معنوں میں تجرید حاصل ہوتی ہے۔ اب کہیں موحد بھی ہوئے اور رحمت و برکت کے دروازے کھلے۔ اب کہیں رحمتِ عالم کے انوار میں آئے۔ برکت اور رحمت کے سایوں میں پھیلنے لگے۔ برکت کے دروازے کھلنے کی نشانی یہ پائی کہ ایسے معصوم ہو گئے کہ جو قدم اٹھایا دوسرے اس پر چلنے لگے۔ بالکل اسی طرح جیسے نوجوان لڑکوں کی ٹولیاں بے حیل و حجت ایک دوسرے کے ساتھ چلنے لگتی ہیں۔

سمٹنا اور پھیلنا

جمعیت میں یہ رنگ، رحمت کے تجریدی انواروں میں ملتا ہے۔ اب جمعیت کے معنوں میں ہر فرد اپنی انفرادیت سے پھیلا ہوا فرد ہوتا ہے۔ اب کہیں جانِ من جانِ عالم کے مصداق ہوئی۔ اپنی انفرادیت کا پھیلاؤ ایک تلوار کی دھار والی زندگی ہوئی جو میان سے باہر نکل آئے۔ کیوں کہ جو میان میں پناہ لیکر بیٹھ جائے، سمٹ جائے، وہ بھی کوئی زندگی ہوئی۔

سمٹنا ہو تو ایسا مرد بنے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں

جگہ ملے۔ یہاں زندگی کے سرچشمے ہیں۔ یہاں فقرِ غیّور اور عشق و ایمان ایک کوندنے والی بجلی کی طرح ہوتا ہے۔ یہاں عاجزی، صبرواستقامت میں اپنی خودی کو اپنا لیا جاتا ہے۔

یہ فقرِ غیّور اب کائنات میں پھیلتا ہے۔ انفرادیت کے جنجالوں سے نکل کر جمعیت کے رنگ میں، اس عالم میں جلوہ آرا ہوتا ہے۔ اور اس طرح ذات میں سمٹا بھی اور جمعیت کے رنگ میں پھیلا بھی۔ ان دونوں کیفیات یعنی سمٹنے اور پھیلنے میں حیات ہے۔ دوام ہے۔ گویا سمٹنے کی شدت ہی ہوتی ہے، جو پھیلنے کی محرک باطنی قوت بنتی ہے۔ یوں صرف توحید کو لے کر سمٹنا ناکافی ہے۔ منصور حلاّج بھی صرف توحید کو لے کر سمٹے یعنی صرف آدھا کلمہ "لا الٰہ الّا اللہ" لے کر نبی کریمؐ کی عبدیت "محمد رسول اللہ" اور اصل سنت کو لے کر نہیں سمٹے۔ یہ سنت اُمّتی اُمّتی تھی جو معراج میں اپنی خودی کی تڑپ بنی رہی اور واپس آ کر جس کے ذریعہ شرعی زندگی کا اجراء ہوا۔ کلمہ کا یہ دوسرا حصہ محمد رسول اللہ ہی نشانی ہے، ذات میں سمٹ کر پھیلنے کی۔ کلمہ کی پوری توحید کو اپنا کر سمٹے اور پھیلے، تب کہیں وہ سادہ لوح بدو بن سکتا ہے، جو قیصر و کسریٰ کے قالین اپنے نیزوں سے ہٹا کر خدا کے فرش پر بیٹھ کر متوکل ہو جاتے تھے۔ یہ بے نیازی اور سادگی ان کے حق الیقین کی نشانی تھی جو ان سادہ مزاجوں کی زندگیوں میں ملتِ اسلامیہ کے ہر اونچ نیچ، نفسا نفسی کو ختم کر کے، اجتماعیت کے رشتے میں مضبوط بن کر محبت کے میدان میں ابھر رہی تھی۔ اب بھی اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے یہی کچھ ہونا ہے۔ تاکہ اسلام کا نقشِ اوّلین، ظاہر باطن کے توازن میں انسانی زندگی کی توحیدِ کلّی میں پیش ہو سکے۔ البتہ مومن کے لئے اس توازن میں، سمٹنے اور پھیلنے کے درمیان، تلوار کی دھار بھی بننا ہے۔ کیونکہ یہی وہ انداز

توحید ہے جس کے سوز سے جمعیت کی زندگی میں مقصدِ حیاتِ مسلم تڑپ ہے، نکھار ہے، دوام ہے۔

یوں بغیر نسبتِ محمدیؐ صرف توحید کو لیں۔ جو دوسرے مذاہب والے بھی کوشش کرتے ہیں، تو رب العالمین تو نہ سمٹے ہیں نہ پھیلے ہیں ''الآن کما کان'' ایسی خشک توحید سے کیا حاصل۔ یہ افیون کا سا نشہ بے فیض بے مقصد۔زندگی کی شدتوں کو بھی پھیکا کر دینے والا۔ اسی لیے بزرگانِ دین نے فرمایا ہے کہ خلقت کو چھوڑا تو خالق کو چھوڑا۔ مقصدِ حیاتِ مسلم صرف خالق کی حمد و ثناء میں محو ہو کر رہ جانا نہیں ہے، بلکہ اس ایمان اور محبوبیت کی خوشبو کو عملی زندگی کے پہلوؤں میں خلقت میں پھیلانا ہے۔ نادریہ سلسلے والے اس میزان میں ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی تلوار کی دھار، رات کو فقیر، دن کو مولوی۔ ان میں ایک استقامت، بھروسہ اور دلبری کی کیفیت موجزن ہوتی ہے۔

اسی کیفیت کو نصیب کرانے کے لئے قرآن کریم نے یَتَفَکَّرُوْن کی جانب توجہ دلائی ہے۔ یہ وہ حالت ہے کہ دل، دماغ، عشق، عقل ایک ہی یکتائی میں یک رخی میں ہوتے ہیں۔ یہ وہ یکتائی ہے جو کائناتِ وجود میں، نور و عشق کی توحید، انوارِ محمدیؐ کی صورت میں گامزن ہے۔ یہ کیفیت اس استغراق سے بالکل جدا ہے۔ جس کے ذریعہ کچھ آگہی نصیب ہو جاتی ہے۔ اسماء اور روحِ اعظم سے بھی رابطہ ہو جاتا ہے۔ یَتَفَکَّرُوْن کے پیچھے تو ترغیب ہے۔ کائنات میں پھیلنے کی اپنے وجود سے صعود کرنے کی محبوبیت کے انوار میں شدتیں حاصل کرنے کی حقیقتِ محمدیؐ تک رسائی کی جو ''وَسِعَ کُلَّ شَیْءٍ'' ہے۔ یہ مقامِ جبروت ہے، مقامِ رحمت ہے۔ مقامِ محبوبیت ہے۔

اس محبوبیت کے طفیل یہ مقامِ امر ہے، عالمِ کُن کی بات ہے۔ محبوبیت

میں ایک نظر کی بات ہے ۔ یہ نظر پیدا ہوتی ہے، تصور سے جو ذکر سے آگے کی بات ہے ۔ تصور میں آ گئے ۔ محبوب، آنکھوں میں بسا ہے، جس کو دیکھا محبوب کی صورت نظر آئی ۔ دوئی اور غیریت نہ رہی ۔ اب یہ نظر جس پر بھی پڑ گئی کام کر گئی ۔ یہ نظر ہی یَنظُرُ بِنُوْرِ اللہ ہے ۔ یہ محبت کے سمندر کی موج ہے جو سب کو ہی بھگوتی ہوئی گذر جاتی ہے ۔ اپنا ہو، اجنبی ہو، کوئی تفرق نہیں ۔ اس لئے کیا عبارت، کیا اشارت، کیا نظر، کیا کلام ۔ یہ ایک امتی ہی کے بس کی بات ہے کہ مجسمہ محبت و رحمت ہو بحرِ علم و عرفان ہو، یہ ازلی چیز ہے، اپنے بس کی بھی بات نہیں ۔ ان انوار میں کلام قلب پر نازل ہوتا ہے ۔

البتہ کلام کی حقیقت اسی وقت بن سکتا ہے، جب بحرِ حقیقتِ انوارِ محمدیؐ سے رابطہ ہو، محبوب سامنے ہو، اور عاجزی اور توکل کی کیفیت ہو تو تختیاں بھی اترتی ہیں، آیات بھی قلوب پر نازل ہوتی ہیں ۔ پھر جیسے ایک بجلی سی کوند گئی ۔ اب یہ حال ہوتا ہے کہ جو اندر ہے وہی باہر اور اس کی تائید قرآن مجید سے ہوتی جاتی ہے ۔ اس کیفیت میں قرآنِ کریم کو سمیٹو تو نافۂ ذات کی طرح بائے بسم اللہ کے نقطے میں مرکوز ہو کے رہ جاتا ہے ۔ قطرہ میں دریا، آنکھ کے تل میں کائنات ۔ قرآن کو پھیلاؤ تو کس کی بساط جو اس کی معنویت کو پھیلا سکے ۔ یہ تو ہزار عالمین، زمان مکان کی حدود سے صعود کر جاتا ہے ۔ جیسے خوشبوئے دوست، عکسِ رخسار، سرِ کن، ظہورِ فیکون ۔

اس سمٹنے پھیلنے کے درمیان برزخ محمد رسول اللہؐ ہے ۔ اس برزخ حقیقتِ محمدیؐ کی تجلی تب ہی ہے، جب آئینہ (مظہرِ حق) ملے ۔ قلبِ مجلّٰی، آئینہ کے مقابل آئینہ، ایک ہی عکسِ رخسار، وجود سے ماوراء نظارے اور نظر کی یکتائی ۔ نہ دوئی، نہ غیریت ۔ اب کہیں اپنے باطن کا عرفان ہوتا ہے ۔ عَرَفَ

نَفۡسَهٗ کی تجلی ہوتی ہے۔ اب کہیں ناسوت سے علیحدہ ہوئے، جبروت میں پہنچے۔ یہ عَرَفَ نَفۡسَهٗ نفس کے عرفان تک کی بات رہی تو نسخۂ ولایت ضرور ہے۔ اپنے مقام تک پہنچا دیتا ہے۔ ایک جذب ایک گم شدگی پیدا کر دیتا ہے۔

مگر غور سے سوچیں کہ اللہ نے ہمیں کیوں پیدا کیا ہے۔تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اندر ایک فطری تڑپ ہے، پھیلنے کی جو دراصل ظِل ہے اسی حق کی خود نمائی کا۔ یہ پھیلنے کی بات ایسی ہے جیسے کہ شاعر کو بغیر کلام سنائے چین نہیں پڑتا۔ یا پھر ایک معصومیت کے انداز میں پھول کہ خوشبو خود بخود پھیلتی ہے۔ ہر متلاشیٔ حق کو حقیقت کا نکتہ پالینے کے بعد یہ تڑپ ضرور ہوتی ہے کہ جب تک ''اَلَمۡ نَشۡرَح'' پھیلنا نہ ہو زندگی تو مکمل ہو جاتی ہے، مگر حیات کی تکمیل نہیں ہوتی۔

پھیلنے کے دو پہلو

ا۔ تفریدی

پھیلنے کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک تفریدی، ایک تجریدی، طریقت کا راستہ تفریدی ہے۔ اور حقیقت کا تجریدی۔ تفریدی پہلو میں اپنا وجود جاذب خلائق ہوتا ہے اور فرد سے فرد کو فیض یا روشنی ملتی جاتی ہے۔ بتی سے بتی جلتی جاتی ہے۔ اس تفریدی پہلو میں پھیلنے سے پہلے سمٹنا ہے۔ مادی زندگی کو بجائے پھیلانے کے سمیٹنا۔ ہر غیر اللہ کی لا اپنے نفس اپنے وجود کی بھی لا۔ اس لیے یہ فنا یہ ''مُوتُوا قَبۡلَ اَنۡ تَمُوتُوا'' جس معنی میں بھی اور جس سطح پر بھی لو صرف سمٹنے کا راستہ ہے۔ یہ مُردار کیفیت نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی ایک مرد ہی کا کام ہے۔ ایک عاشق ہی کے بس کی بات ہے۔ کہ سرِ خفا کنزِ مخفی سے روشناس کے

بعد بھی سر محبوب کے قدموں میں ہو۔مَیں فانی تُو باقی۔ محبوب میں بقا۔ پھر اسی کیف، اسی خوشبو میں پھیلنا یہ اپنے نافۂ ذات کی خوشبو ہے، جو درحقیقت اسی حق کی اپنے اندر تجلّی ہے، جب تک عالَمِ جبروت سے بارانِ رحمت نہ ہو، کس کی مجال، کس کے بس کی بات کہ پھیلے اس تفریدی راستے میں، بہ ظاہر کتنا ہی عجز ہو۔ کہیں نہ کہیں مَیں ضرور شامل ہوتا ہے اس کیفیت خود آ گہی، ''عَرَفَ نَفْسَہٗ'' میں سرپائے یار پر رہنا آسان بات نہیں۔ امام غزالیؒ نے بھی اس کی تنبیہہ کی ہے۔ یہ انا ہوتی تو بڑی زبردست ہے کہ کسی معمولی بات پر کسی فقیر کی تیوری پر بل آئے تو بیڑہ ہی غرق ہو جاتا ہے۔ البتہ انفرادی خدمت کے مواقع بھی بہت ہوتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ کچھوے کی طرح اپنی ضرورت پوری کرنے کے بعد اپنے خول میں واپس ہو جاتے ہیں، مشکل سے ہی اپنے پر ہاتھ رکھنے دیتے ہیں۔ اور مردِ میدان وہ ہوتے ہیں جن کی طاقت اپنی ریڑھ کی ہڈی یعنی باطن میں ہوتی ہے۔ یہ خلقت کے کام آتے ہیں کم از کم انسان تفریدی راستے میں بھی اتنا تو ہو کہ پھیل سکے۔ دوسروں کے کام آسکے۔

۲۔ تجریدی

تجرید میں تفرید کے بالمقابل نہ کوئی تیوری، نہ کوئی بل۔ یہاں انفرادیت کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ ایک عالمی غم ہوتا ہے۔ نہ معلوم کیوں آنسو آتے ہیں۔ اگر اپنے آپ سے بھی پوچھے کہ کیا غم ہے تو کچھ پتہ نہیں چلتا کیوں کہ یہ شعور سے بالاتر بات ہے۔ یہ نامعلوم بے معنی سے آنسو درحقیقت عالَمِ جبروت کی بارش ہوتی ہے۔ جہاں محبت ہی محبت، رحمت ہی رحمت ہے۔ نسبتِ محمدیؐ ہے۔

می گریم واز گریہ چوں طفلے خبرے نیست
در دل ہَوس ہست نہ دانم کہ خدا کیست

''روتا ہوں اور بچہ کی طرح آنسوؤں کی خبر نہیں کہ کیوں۔ دل میں
ایک آرزو ہے یہ بھی نہیں معلوم کہ خدا کون ہے''

اس عالمِ رحمت میں اک ہوا سی چلتی ہے۔ جس کو زمانہ اپنا لیتا ہے۔ اب رہا یہ کہ کیا یہ کیفیت اپنے بس کی بات ہے، تو ہاں جب یہ لفظ اپنی تختی سے مٹ جائے تو اپنے بس کی بات ہے۔ کیوں کہ اب محبوب سے کوئی دوئی نہیں۔ جامع اور مکمل انسان وہی ہوا جو باطن میں سمٹا ہو اور ظاہر میں پھیلا ہوا ہو۔ یہی قرونِ اولیٰ کے مسلمان مجاہدوں میں بات تھی۔ کہ رات بھر سجدے میں گذارتے تھے۔ جائے نماز آنسوؤں سے تر ہوتی اور صبح ہاتھ میں تلوار لے کر محبوب کے نام پر کائنات میں پھیلتے۔ اپنے علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں مولانا سلیمان اشرف کو دیکھا کہ رات کو فقیر، دن کو کٹر مولوی۔ تو ازن حیاتِ انسانی کے لئے لازم ہے۔ فطرت کے لیل و نہار کے ساتھ ہم آہنگی یہی ہے کہ دن دنیا کا، رات یار کی۔ دن میں طریقت کو اپنایا۔ رات کو حقیقت کے سمندر میں غوطے لگائے۔ کوئی موتی ملا نہ ملا یہ اپنا مقدر ہے۔

بقائے نسل، حفاظت اور تسلسل

سائنس کے نقطۂ نظر سے اس سکڑنے پھیلنے کو دیکھیں تو جو زندگی ہے یا ارتقاء ہے، اس میں بقا کے دو پہلو ہیں۔ ایک اپنی جان کی حفاظت، نسل کی حفاظت دوسرے اس کی نشو و نما اور تسلسل کی پیہم کوشش۔ اس کے لئے تحت

الشعور اور جبلتوں میں بقا کی وہ وہ قوتیں چھپی ہیں کہ انسان حیرت میں رہ جاتا ہے۔ مگر فرد تو ایک نقطہ ہے۔ نقطہ ہی سے لکیر بنتی ہے۔ اس طرح فرد کی اہمیت بقائے دوام کے اعتبار سے ادنیٰ ہی سہی، مگر وہ ایک اہم کڑی ہے تسلسلِ نسل کی۔ اس سے ایک قدم آگے یا پیچھے جائیں تو یہ جو کائنات کا ارتقاء ہوا ہے، اس میں ستارے جو بنے وہ ایک عالمی غبار تھا جو سمٹتے سمٹتے مختلف سورجوں یا ستاروں میں تبدیل ہوا۔ بعض صورتوں میں یہ عالمی غبار سمٹتے سمٹتے اپنی کششِ ثقل سے اتنا ٹھوس بنتا چلا جاتا ہے کہ خود اپنی بے پناہ قوتِ ثقل سے کچلا جاتا ہے۔ اور ایک دم پھٹتا ہے پھر اس سے نظامِ سیارگان، اس ستارے کے اردگرد وجود میں آتا ہے۔

اسی طرح ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ'' جب سمٹتے سمٹتے اپنی باطنی قوت کی شدت، اپنے اندر جذب کرنے کی حد سے گذر جاتا ہے تو پھٹتا ہے اور اس کے گرد بھی نظامِ سیارگان کی طرح اس کے کئی بچے کائنات میں پھیل جاتے ہیں۔ اس نظریئے کے تحت دیکھا جائے تو سمٹے بغیر اور شدتیں حاصل کئے بغیر پھیلنا کیسے۔ مگر کیا چیز سمٹے، کیا پھیلے۔ عَرَفَ نَفْسَهٗ جو سمٹ گیا، جس نے کائنات کو، حق کو سمیٹ لیا، پھر وہی حق پھیلتا ہے۔ فرد ہے کہاں، غیرِ حق کی گنجائش کہاں۔ تو گویا سمٹنے کی حالت میں سب کچھ فنا بس ایک محویتِ ذات جسے خدا کہہ لو اور پھیلنے کی حالت میں خدائی۔

ذات میں سمٹنا، صفات میں پھیلنا

تخلیقِ کائنات بھی اسی طرح ہوئی کہ سمٹی ہوئی ذات صفات میں پھیلی۔ سمٹنے میں حُب کی بے پناہ قوت، کُن کی قوت ہو کر پھیلی۔ غارِ حرا سمٹنے کا

دور تھا۔ کوہِ فاران پھیلنے کی نشانی۔ اُمّی ہونا شدتوں میں سمٹنا اور قرآن شدتِ کُن میں پھیلاؤ ہے۔ **لیلۃ القدر** سمٹنا ہے۔ **مطلع الفجر** ان انوار کا پھیلنا ہے۔ یہ مطلع الفجر ہی خلقت کے کام کی چیز ہے۔ اکثر طالبانِ حق کی سحر، مطلع الفجر وجود سے چھٹکارے کے بعد ہوتی ہے۔ خواہ جیتے جی یا مرنے کے بعد، اسی لیے یہ اس وقت گمنام ہوتے ہیں۔ نہ کوئی جانتا ہے نہ پہچانتا ہے۔ البتہ صبحِ وصال کے بعد پھر کہیں وہ پھیلتے ہیں، ظاہر ہوتے ہیں۔ خلقت کے کام آتے ہیں۔ معراج کے واقعہ کو لیا جائے تو معراج کا ایک پہلو ذات میں سمٹنا ہے۔ اور واپس خلقت میں آنا صفات میں پھیلنا ہے۔ یہ معراج سے واپس لوٹ آنا کمالِ انسانیت ہے۔ شانِ رحمت کا ظہور، نزول ہی میں ممکن تھا عروج میں نہیں، اس لیے یہ معراج سے واپسی احسان ہے، انسانیت پر اُدھر اللہ سے واصل، اِدھر مخلوق میں شامل ہیں۔

اس طرح ذاتِ نبی کریمؐ حقیقت محمدیؐ اایک سورج کی طرح سمٹی ہوئی بھی ہے اور دھوپ کی طرح پھیلی ہوئی بھی۔ تو یہ بڑا دھوکہ ہے کہ آنحضرتؐ وجود میں آئے، وصال ہوا، اور پردہ فرما گئے۔ نورِ محمدیؐ تو ہمیشہ سے تھا، ہمیشہ رہے گا۔ ایسا سمجھیں کہ ''وَسِعَ کُرْسِیُّهُ السَّمٰوَات'' ذات، ایک وجود کے آئینہ میں کچھ دیر کے لئے نظر آ گئی، آئینہ ہٹا دیجئے تو جو ہمیشہ تھا، وہ ہمیشہ ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ سکڑنے کے بغیر پھیلنا کیسے ہو۔ تفرید کے بغیر تجرید کیسے ہو۔ افلاطون کا کہنا ہے کہ پہلے خیال آتا ہے پھر وجود آتا ہے۔ اس لیے پہلے تجرید پھر تفرید۔ اس نظریے کے تحت یہ کائنات پہلے پھیلے گی، پھر ایک حد کے بعد سکڑنا شروع ہو جائے گی۔ یہی کچھ ارتقائے حیوانی میں ہوگا۔ پہلے پھیلنا، پھر سمٹنا معنی خیز بات ضرور ہے۔ ابتدائے آفرینش سے لیا جائے تو

ہر ذرۂ کائنات کی ابتدا، اس کی حیات اور بالاخر اس کا انجام، ''انا للہ و ان الیہ راجعون'' ہے۔ پہلے چھپا خزانہ، پھر اس خزانے کا اظہار، پھر اس کا اپنے اصل کی طرف رجوع۔ یہی کچھ زندگی کی تمام منازل ظہور، ارتقا اور اختتام میں نظر آرہا ہے۔ یہ سمٹنا پھیلنا ایک لازم وملزوم سی صفت ہے۔ ایک سلسلہ جاریہ ہے اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے۔ ہر روز نئی آن نئی شان ''کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَان'' تفریدی اور تجریدی دونوں حالتوں میں سکڑنا پھیلنا، حق کے نمود کی ایک شانِ ظہور بنا ہوا ہے۔

''کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ وَّ یَبْقٰی وَجْهُ رَبِّکَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ''

ہر لا الہ کی فنا، وَجْهُ رَبِّکَ کی بقا۔ اس وَجْهُ رَبِّکَ کی آئینہ داری جب قلب میں ہوتو کائنات کا ذرہ ذرہ اس تفرید، اس آئینہ کی آئینہ داری کرتا ہے۔ تجرید باطن کی بات ہے۔ یہاں محبوب جلوہ افروز ہے۔ وہ عالمِ شوق کی، وارفتگی، وہ عشق کی جنوں سامانیاں ایک کیفیتِ وصالِ دائم۔ ہوش کا یہاں دخل کہاں۔ نہ آرزو ہے، نہ تمنا ہے نہ خواہش۔ بس طلب ہے، تو محبوب کی، تصور ہے تو پائے ناز کا، دیدار کی تمنا بھی بے ادبی ہے۔

برزخِ محمدیؐ

یہ برزخِ محمدیؐ ہے۔ مقامِ جبروت ہے۔ پہلے ناسوت اور جبروت یعنی حقیقتِ محمدیؐ کے درمیان، شیخؒ کی صورت برزخ تھی۔ اب محبوبِ ازلی کی طلب میں نئی حیات ہے۔ فیض وکرم سے ''مُوتُوا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُو'' نصیب ہو چکا ہے۔ اپنا سب کچھ ختم، نہ دماغ نہ ارادہ، نہ نفس نہ قلب، نہ وجود نہ جان۔ یہ اپنے میں موت، محبوب میں بقا۔ اب جیتے جی مرنے کے بعد شیطان کے دخل

کی گنجائش کہاں۔ اب تو انواروں کی دنیا ہے۔ دل، دماغ، وجود سب ایک رخ ہیں ایک محویت ہے۔ اپنا پتہ نہیں یار ہی کی کارفرمائی ہے۔ خیال کی طرح یار بھی ساتھ ہی ساتھ ہے۔

چوں خیالے در دلت آمد نشست
ہر کجا کہ میگریزی با تو ہست

''خیال کی طرح دل میں آ بیٹھا ہے۔ جدھر بھی بھاگ کر جائے
ساتھ ہی لگا ہوا ہے''

یہ برزخ محمدیؐ ہے۔ ہر طرف انوار ہی انوار ہیں۔ شمسِ محبوبیت کی تجلی ہے۔

من چو صبح صادقتم از نورِ رب
کہ نگرد گردِ روزم، ہیچ شب

''میں رب کی نور کی وجہ سے مثل صبح صادق کے ہوں کہ میرے دن کے
گرد کوئی رات نہیں آتی''

برزخِ محمدیؐ میں عمل پیرائی

اب نہ صبح ہے نہ شام، نہ فراق ہے نہ جدائی۔ نہ زمان مکان کی پابندیاں ہیں نہ جسم، جان، روح کی قید ہیں۔ نہ کوئی اجنبیت ہے، نہ غیریت، نہ دوئی ہے نہ وہم، نہ پردے ہیں نہ حجاب۔ جدھر دیکھو ایک ہی خورشید عالمتاب کی ضوء نشانی ہے۔ ''رَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ'' اسی کا ذکر آسمانوں اور زمینوں، اپنی لطافتوں اور وجود میں بلند ہے۔ اسی کی ضوء نشانی سے ذرہ ذرہ وجود کا چمک اٹھا ہے۔ روئیں روئیں سے ذکر چھلک رہا ہے۔ ایک سدا سہاگن کا روپ اپنی زندگی کا سہاگ بھی بنا ہوا ہے، اور کائناتِ وجود کا بھی۔ اندر باہر

ایک ہی جلوہ آرائی ہے۔ سمٹو، پھیلو سب کچھ ایک ہی کیفیت ہے۔ نافۂ ذات میں دیکھو یا باہر گیسوئے مشکین کی خوشبو بن کر پھیلو، ایک ہی بات ہے، یہ مقامِ تجرید ہے۔ اس کا سمٹنا بھی حسین، اس کا پھیلنا بھی حسین۔ جو خوشبو اپنے وجود کے باطن میں ہے، وہی باہر پھیل رہی ہے۔

جو خیال اپنے باطن کی گہرائیوں میں جاگ اٹھا ہے وہی عالمِ امکان میں عملی پیرایہ میں لوگوں کی زندگیوں میں حیاتِ نو کی شکل میں ابھر رہا ہے جو روشنی اپنے باطنِ وجود میں برق بن کر چمکی، وہی زمانے میں نئی تابندگی بن کر جلوہ فگن ہوئی۔ جو تلاطم اپنے مرکزِ وجود میں آیا وہی طوفاں بن کر عالمِ امکان میں پھیلا۔ جو شکل اپنے باطن میں اتری اسی کا عکس عالمِ امکان کے باہر آئینہ (مظہرِ حقیقتِ محمدیؐ) میں نظر آیا۔ اور آئینے سے آئینے بنتے چلے گئے۔ یہ تجرید میں سمٹنے اور پھیلنے کی بات ہے۔ سمٹنے میں شدتیں پھیلنے میں وارفتگیاں۔ سمٹنے میں کنزِ مخفی، پھیلنے میں خلقتُ الخلق۔ سمٹنے میں کُن، پھیلنے میں فیکون۔ ایک ہی وحدتِ وجود، ایک ہی وحدتِ شہود۔ اسی شمسِ حقیقت میں سمٹنا، اسی کی روشنی بن کر پھیلنا۔ محبوب میں سمٹنا، عشق میں پھیلنا، عجز میں سمٹنا، رحمت میں پھیلنا۔ معنیٔ قرآن ہو کر سمٹنا "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللہ" ہو کر پھیلنا۔ حقیقت میں سمٹنا، شریعت میں پھیلنا۔ "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ" میں سمٹنا "محمد رسول اللہ" میں پھیلنا۔ ذات میں سمٹنا، صفات میں پھیلنا۔ ابتداء اِنَّا لِلّٰہ اور انتہاء "اِلَیْہِ رَاجِعُوْن"

وظائف و لطائف

حکیم ترمذیؒ نے نوادر الاصول میں فرمایا کہ ہمیں حدیث بیان کی عمرو

بن ابوعمرؒ نے انہوں نے کہا کہ ہمیں حدیث بیان کی ابو ہمام بلالؒ نے ابراہیم بن لحمان سے وہ عاصم بن ابی النجود سے وہ زر بن حبیش سے وہ حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے، فرماتے ہیں وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام حاضر ہوئے وہ آپؐ کے ہاں ہی تھے کہ اچانک ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ آگئے۔ حضرت جبرائیل نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ یہ ابو ذر رضی اللہ عنہ ہیں حضور صلی االلہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے امین! تم ابو ذر کو جانتے ہو؟

جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا قسم ہے مجھے اس اللہ کی جس نے آپؐ کو حق دے کر بھیجا ہے آسمانوں والوں میں ابو ذر رضی اللہ عنہ زمین والوں سے زیادہ مشہور ومعروف ہیں اور یہ اس لیے کہ یہ روزانہ دو دفعہ ایک ایسی دعا مانگتے ہیں کہ جس سے فرشتے بھی تعجب کرتے ہیں۔ آپؐ ابو ذرؓ کو بلا کر اس دعا کی بابت پوچھئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو ذرؓ کو بلا کر فرمایا۔ ابو ذر ایک دعا ہے جو تو روزانہ دو دفعہ دن میں پڑھتا ہے۔ ابوذرؓ بولے۔ ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں، وہ دعا میں نے کسی انسان سے نہیں سنی وہ تو دس حرف ہیں جن کا میرے رب نے الہام کیا ہے۔ اور میں دو دفعہ دن میں پڑھتا ہوں۔ قبلہ کی طرف منہ کر کے کچھ دیر حمد وتکبیر کرتا ہوں اور پھر لا الہ الا اللہ پڑھتا ہوں، پھر وہ کلمے بطور دعا پڑھتا ہوں۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ اِیْمَانًا دَائِمًا وَّاَسْئَلُکَ قَلْبًا خَاشِعًا وَّاَسْئَلُکَ عِلْمًا نَافِعًا وَّاَسْئَلُکَ یَقِیْنًا صَادِقًا وَّاَسْئَلُکَ دِیْنًا قَیِّمًا وَّاَسْئَلُکَ عَافِیَۃً مِنْ

كُلِّ بَلِيَّةٍ وَّاسْئَلُكَ تَمَامَ الْعَافِيَةِ وَاسْئَلُكَ الْغِنٰى عَنِ النَّاسِ .

ترجمہ:۔ ’’اے اللہ! میں تجھ سے ہمیشہ رہنے والا ایمان مانگتا ہوں اور تجھ سے خشوع کرنے والا (ڈرنے والا) دل مانگتا ہوں، اور نفع دینے والا علم مانگتا ہوں اور تجھ سے سچا یقین مانگتا ہوں، اور تجھ سے دین راست مانگتا ہوں اور تجھ سے امن مانگتا ہوں ہر بلا سے اور تجھ سے دائمی امن کا خواستگار ہوں۔ عوام الناس سے بے پروا ہو جانے کا چاہتا ہوں‘‘

حضرت جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مجھے قسم ہے، اس ذات کی جس نے آپؐ کو سچا نبی بنا کر بھیجا ہے۔ آپؐ کی امت میں سے جو شخص بھی یہ دعا پڑھے گا، اس کے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اگر چہ وہ سمندر کی جھاگ سے بھی زیادہ ہوں اور زمین کی مٹی کے برابر ہوں۔ آپ کی امت میں سے جو شخص بھی اللہ کی مناجات کرے گا اور اس کے دل میں یہ دعا ہوگی تو جنت اس کی مشتاق ہوگی اور فرشتے اس کی معافی کے لیے دعا کریں گے اور اس کے لیے جنت کے دروازے کھل جائیں گے اور فرشتے کہیں گے کہ اے اللہ کے دوست! بہشت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہو جا۔

(کنز العمال جلد اول صفحہ ۳۰۴ شمارہ ۵۰۶۴)